پرتو روہیلہ

غالبؔ کے ایک اہم فارسی خط کا کچھ احوال (بنام مولانا محمد عباس رفعتؔ)

Parto Rohela

Description of an Important Persian Letter of Ghalib

Ghalib's every letter, be it in Urdu or Persian, addressed to anyone, whether a literary giant, or a common contemporary - not significant in any way, is a genuine treasure-trove for the Ghalib-lovers. His Persian letters written to a great variety of his contemporaries have a very special meaning for their bold high sounding chaste Persian masterly phrases, intricate expressions and un-paralleled flight of imagination. The letter under consideration is a letter in Persian written by Ghalib to one Maulana Muhammad Abbas Rifat of Bhopal. This letter was written by Ghalib in Persian on very special request of Maulana Muhammad Abbas after his repeated requests.

Maulana Muhammad Abbas Rifat one of the great scholars of his times, was Ghalib's outstanding Shagird (Student) and used to consult him on his Persian poetry. This letter a real epitome of Ghalib's Persian Insha Nigari has recently gained more importance on account of the fact that some well-known scholars of Urdu & Persian of Indo Pak. have expressed their views regarding this letter and its addressee Maulana Muhammad Abbas Rifat in detail.

۱۔ خط کا فارسی متن

''والا یزدانِ ہست و بود را آفرین کہ نگاشتنِ وخشور و فرستادنِ منشور از آلائ اوست بے مرنیایش، و آورندۂ گرامی منشور ہمانا ہمایون و خشور را کہ پس از وی از آن دہ و دو پیرۂ وخشور کہ باز پسینِ آن جمع، با خداوند در نام انبازی دارد، ہر یکی بہر ہنگام بجای اوست، بی انداز ستایش۔ غالبؔ سخن گزار، ہیچ منگار، اگر درین مردہ دلی سوئ کلک و کاغذ گرایش دارد ہم بیمن توانائی آن نیایش نیرو فزائی این ستایش، دارد۔ نامہ نگار را بسا دوستانند کہ سوادِ مردمِ چشم گزرگاہ آنان نشدہ و در سیہ خیمۂ سویدای دل می مانند۔ نیرنگ روزگارِ دورنگ نگر ستنی است۔ پست پایگی بدان پایہ کہ از فرومانگی، خاک نشینِ یک شہرم و بلند نامی بدان اندازہ کہ بمیانجگیریٔ خامہ و نامہ، روشناسِ اعیان دہرم۔ حاشا کہ ایں چنیں پست پایۂ بلند نام

جزمن درد ہرتوان یافت۔ از دیر باز بہ نظم ونثرنمیگرایم۔ نظم خواہی پارسی خواہی اردو، خوابیست فراموش، نامہ در پارسی نبشتن نیز آئین نمانده، ہرچہ نبشتہ میشود یکدست درار دواست۔

اینک خواجۂ حق پرست شناسِ بلند پایہ مولانا محمد عبّاس کہ ہم از آن گروہِ پرشکوہ است کہ با من بزبانِ قلم راہِ سخن کشودہ اند، از بھوپال فرمان فرستاد کہ غالبؔ فرسودہ روان بنام آن ہمہ دان، نامہ در پارسی نویسد۔ یارب فرمان چون بجای آرم و درنامہ چہ نویسم؟ باری نہ از توانائی بنان بلکہ از اثر روائی آن فرمان، جنبش خامہ لفظی چند کہ بخواندن نیرزد، بروی ورق فرو ریخت تا آں ورق بہم پیچیدہ سوی کارفرماروان داشتہ آمد چشمداشت آن کہ برگِ سبز از درویش (را) تحفگی پزیرفتہ آید۔ نگاشتۂ سہ شنبہ بست وچارم ربیع الاوّل ۱۲۷۸ ہجری۔

۲۔ اردو ترجمہ:

ہست و بود کے خالقِ کل کی بے حد ثنا کہ نبی کا مبعوث کرنا اور منشور (آسمانی) کا نازل کرنا اس کی نعمتوں میں سے ہے اور اس ہدایت نامۂ گرامی کے لانے والے پیغمبر پر بے انتہا درود کہ اس کے بعد اس کے بارہ اماموں میں سے ہر ایک خداوند کے نام سے نسبت رکھتا اور ہر ایک ہمیشہ کے لیے ان کا قائم مقام ہے۔

غالبؔ مکتوب نگار کہ جس کو ہیچ منگار (نا قابل نگارش) کہنا درست ہوگا اگر اس مردہ دلی میں بھی قلم و کاغذ کی طرف رغبت رکھتا ہے تو یہ بھی اس تمجید کی توانائی اور اسی تعریف کی طاقت کی برکت کی بنا پر ہے جو اسے حاصل ہے۔ مکتوب نگار کے بہت سے ایسے دوست ہیں کہ کبھی آنکھ کی پتلی کے نواح سے بھی جن کا گزر نہ ہوا لیکن میرے سویدائے دل کے سیاہ خانے میں مقیم ہیں۔ اس زمانۂ دورنگ کا فریب قابل دید ہے، کم حیثیتی اس درجے کی کہ میں عاجزی کے سبب ایک شہر کا خاک نشین ہوں اور شہرت کا یہ عالم کہ قلم اور خط کے واسطے سے اکابر روزگار کا آشنا ہوں۔ ایسا کم درجہ نامور زمانے میں میرے سوا مشکل ہی سے ملے گا۔ عرصے سے نظم ونثر کی طرف رغبت نہیں۔ نظم (تو) وہ اردو ہو یا فارسی خوابِ فراموش ہو چکی ہے۔ (یہاں تک کہ) فارسی میں خط لکھنا بھی دستور نہیں رہا۔ جو کچھ بھی لکھتا ہوں یک قلم اردو میں ہی لکھ دیتا ہوں۔ اس صورتِ حال میں آقائے حق پرست حق شناسِ گرامی مرتبہ محمد عباس نے کہ خود اُس والا شان جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے میرے ساتھ بزبان قلم راہِ سخن کھول رکھی ہے، بھوپال سے یہ حکم بھیجا ہے کہ غالبؔ خستہ جاں اُس ہمہ دان کو فارسی میں خط لکھے۔ خدایا اس حکم کی تعمیل کس طرح کروں اور خط میں کیا لکھوں۔ بارے انگلیوں کی توانائی سے نہیں بلکہ اس حکم نامے کے اثر سے چند الفاظ جو پڑھے جانے کے لائق (تو) نہیں (البتہ) جو قلم سے اِس ورق پر ٹپک پڑے ہیں (یہاں تک) کہ خط کو تہ کر کے کارفرما کو روانہ کر دیا گیا ہے۔ امید یہ ہے کہ اس کو برگِ سبز است تحفۂ درویش کے مصداق قبول کیا جائے گا۔ محررہ منگل ۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۷۸ھ۔

۲۔ دریافت وتوضیحات:

غالبؔ کے اس ایک خط پر اردو اور فارسی کے کئی ممتاز ادبا نے قلم اٹھایا ہے۔ سب سے پہلے میں ڈاکٹر سید حامد حسین کے مضمون ''غالب کے نام دو غیر مطبوعہ خطوط'' سے شروع کرتا ہوں۔ یہ مضمون نقوش کے غالبؔ نمبر حصہ دوم شمارہ نمبر ۱۱۳، اکتوبر ۱۹۶۹ء میں چھپا ہے۔

''کلیات نثرِ غالب'' میں ایک خط غالبؔ کا مولانا محمد عباس بھوپالی کے نام شامل ہے۔ (کلیات نثر غالبؔ مطبع نولکشور لکھنؤ اپریل ۱۸۸۸ء۔ ص ۶۔۲۴۵)۔ مولانا محمد عباس (۱۸۹۷۔۱۸۲۶) رفعتؔ تخلص کرتے تھے۔ فارسی اور اردو نثر میں انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ کہا جاتا ہے فارسی نظم میں غالبؔ سے مشورہ کیا۔ اردو کلام کا بھی ایک دیوان مرتب کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں اُسے تالاب میں غرق کر دیا۔

مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالبؔ میں ان کے بارے میں ایک تفصیلی نوٹ شامل کیا ہے۔(۱۲۹۔۱۲۵)۔ جناب نادم سیتاپوری نے اپنی تصنیف ''غالبؔ نام آورم'' میں ''غالبؔ کے دو ہمنام معاصر'' کے زیرِعنوان ایک مضمون میں رفعتؔ کا ذکر کیا ہے(۱۴۲۔۱۳۹)۔

''رفعتؔ کے نام غالبؔ کا صرف ایک خط فارسی مکتوبات میں ملتا ہے۔مگر واقعہ یہ ہے کہ غالبؔ کے کافی خطوط رفعتؔ کے کتب خانے میں موجود تھے جن کے دیکھنے والے آج بھی زندہ ہیں۔رفعت کے مرنے کے بعد جب ان کا ترکہ ان کی اولادوں میں تقسیم ہوا تو یہ کتابیں اور نوادرات بھی اثاث البیت کی طرح بانٹ لئے گئے۔جس کا ایک حصّہ تو تلف ہو گیا اور نوادرات کا کافی ذخیرہ حیدرآباد دکن پہنچ گیا۔مشہور ہے کہ غالبؔ کے یہ خطوط بھی اسی سلسلے میں حیدرآباد دکن پہنچے اور اب وہ کس کے قبضے میں ہیں اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا'' ص ۱۴۴۔

''مقامی طور پر چھان بین کرنے پر ان روایات کی تصدیق نہیں ہو سکی اور نہ رفعتؔ کے باقی ماندہ کاغذات میں سوائے اس خط کی نقل کے جو کلیات نثر میں شامل ہے، غالبؔ کی کسی اور تحریر کا سراغ مل سکا۔ یہ ضرور ہے کہ رفعتؔ نے غالبؔ کے خط کی جو نقل محفوظ کی ہے، اس کی عبارت میں مطبوعہ خط کی عبارت سے بعض مقامات پر خاصہ اختلاف ہے۔ بہرحال غالبؔ کے خطوط کی تلاش کے دوران رفعتؔ کے دو ایسے خطوط کی نقلیں بھی دریافت ہوئی ہیں جو غالبؔ کو لکھے گئے تھے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک خط کے جواب میں غالبؔ نے وہ خط لکھا ہے جو کلیات نثرِ غالبؔ میں موجود ہے.....'

''یہ خط یہاں مولانا عباس رفعتؔ کی تصنیف ''نوردیدہ'' کے مبیّضہ سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ مبیّضہ ۱۲۹۰ھ میں تیار کیا گیا ہے۔اور یہ خط غالبؔ پر ایک مختصر نوٹ کے ساتھ ص ۵۴۔۵۳ پر درج ہے۔یہی متن دو جگہ معمولی فرق کے ساتھ یار محمد خان شوکت کے نام سے مطبوعہ ''انشائے نورِ چشم'' (مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۹ھ) میں شامل ہے۔ص ۵۲۔۵۱۔اس تصنیف میں رئیس ٹونک کے نام ایک منظوم خط بھی نقل کیا گیا ہے اور ان دونوں خطوط کے ساتھ یہ نوٹ درج ہے۔

''چند سال وفات سے پہلے میرزا صاحب نے خطوط اردو میں لکھنا اختیار کیا تھا۔مولانا محمد عباس رفعتؔ نے بھوپال سے میرزا صاحب کو لکھا کہ میں فارسی عنایت نامہ کا مشتاق ہوں۔ جناب مرحوم نے ان کو خط فارسی تحریر فرمایا جو کہ ہر دو خط منظوم و منثور کلیاتِ دیوان دانشہائے جناب موصوف میں میری نظر سے نہیں[1] گزرے۔اور وہ میرے پاس موجود تھے۔ بمراد اشاعت کلام اوستاد و استفادۂ ادبائے نقاد احقر العباد نے تبرکاً اسے اپنی انشا میں رقم کئے۔ص ۴۸۔۴۷۔''

دوسرا مضمون جناب آفاق احمد صاحب کا ہے جو ''غالبؔ کے نو دریافت خطوط'' کے عنوان کے ساتھ نقوش کے غالب نمبر میں ۹۹۔۹۶ میں چھپا ہے۔اب میں اس مضمون کے متعلقہ اقتباسات تحریر کرتا ہوں۔

''غالبؔ صدی کے دوران دوسری اہم دریافت غالبؔ کے تین خطوط ہیں (پہلی دریافت غالبؔ کا خود نوشتہ دیوان ہے جو ۱۸۔اپریل ۱۹۶۹ء کو بھوپال کے ایک تاجر کتب سے امروہے کے ایک تاجر کتب نے حاصل کیا) ۲۵ جولائی ۱۹۶۹ء کو یہ خط دریافت کئے گئے۔ان میں سے ایک خط فارسی میں ہے اور باقی دو خطوط اردو میں۔اردو والے خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ خطوط مولانا عباس رفعتؔ شروانی کے نام ہیں۔مولانا عباس رفعتؔ، مرزا غالبؔ کے بھوپالی شاگردوں میں ممتاز مقام کے مالک تھے۔ یہ خطوط غالبؔ نے ۱۲۷۸ھ میں مولانا عباس رفعتؔ کو تحریر کئے۔ان خطوط کی دریافت کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔

''بھوپال میں اُن دنوں غالبؔ کے.....نوادرات کی تلاش کا کچھ زیادہ ہی زور تھا۔میں نے اپنے محترم نانا سید علی نقی صاحب مرحوم کے

کاغذات اور کتابوں کو کھنگالنا شروع کیا۔ مولانا عباس رفعتؔ کے کئی قلمی نسخے، مختلف خطوط اور دیگر اہم کاغذات تو ملے، نہیں ملی تو غالبؔ کی کوئی تحریر۔ مولانا عباس رفعتؔ، سید علی نقی صاحب کے دادا تھے۔

''جناب نادم سیتاپوری نے اپنی کتاب ''غالبؔ کے کلام میں الحاقی عناصر'' میں ایک جگہ مولانا عباس رفعتؔ کے باب میں تحریر کیا ہے ''رفعت شروانی غالبؔ کے دوست بھی تھے اور شاگردِ رشید بھی۔ کم از کم دو تین درجن خطوط رفعتؔ کی وفات تک اس خاندان میں موجود تھے۔ علی نقی شروانی بھوپالی (نبیرۂ رفعت) بیان فرماتے تھے کہ دادا جان کی وفات کے بعد جب ان کا ترکہ اُن کی اولاد میں تقسیم ہوا تو کتابوں اور اثاث البیت کی طرح غالبؔ کے یہ غیر مطبوعہ خطوط بھی اس تقسیم میں آ گئے جن کا کچھ حصہ تلف ہو گیا اور نوادرات کا کافی ذخیرہ حیدر آباد دکن پہنچ گیا.....ص۶۲۔''

''جب نانا مرحوم کے یہاں کچھ پانے میں مایوسی ہوئی تو اپنی نانہال کے دوسرے گھر کو تلاش کا مرکز ٹھہرایا۔ یہ گھر مولانا عباس رفعتؔ کے پوتے صوبیدار میجر رضا حسن کا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر پرانی کتابوں اور کاغذات کی الماریوں کو خوب خوب دیکھا بھالا.....مگر نہ تھی تو غالبؔ کے ہاتھ کی کوئی تحریر..... بالآخر کچھ دنوں بعد والدہ وہاں کسی تقریب میں گئیں تو وہ مژدہ لائیں کہ خطوط مل گئے ہیں۔ میں بھاگا بھاگا پہنچا۔ میرے سامنے ایک رجسٹر تھا جس میں مولانا عباس رفعتؔ کے نام غالبؔ کے تینوں خطوط موجود تھے۔ دو غیر مطبوعہ اردو کے اور ایک فارسی کا جو مطبوعہ ہے.....اس رجسٹر کو جگہ جگہ سے دیمک نے کھایا ہوا تھا۔ آج ان خطوط کو آپ کے سامنے غالبؔ کے اپنے خط میں عکس کے ذریعے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

مرزا غالبؔ کے ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا عباس رفعتؔ ان کے صرف شاگرد ہی نہ تھے بلکہ مرزا کے رفعتؔ سے دوستانہ مراسم تھے۔ جب ہی تو خود رفعتؔ نے کہا ہے ع بود غالبؔ دہلوی از زمرۂ یاران من۔ غالبؔ کا پہلا خط ظاہر کرتا ہے کہ غالباً رفعتؔ نے مرزا سے خط کا جواب نہ دینے کی شکایت کی ہوگی جس کا جواب انہوں نے دیا ہے۔ نیز عربی کے ایک قصیدے کی رسید (رفعتؔ فارسی کلام غالبؔ کو دکھاتے تھے)۔ ان کا دوسرا خط ان کے مخصوص رنگ میں ہے۔ اس میں غدر کے اثرات مابعد کی خوب عکاسی کی ہے۔ اس زمانے کے اکثر خطوط میں یہ کرب پایا جاتا ہے۔

''(غالبؔ کا تیسرا خط فارسی میں ہے)۔ دراصل مولانا رفعتؔ کی یہ خواہش تھی کہ مرزا انہیں فارسی میں خط لکھیں لیکن مرزا نے اس زمانے میں خط و کتابت قریب قریب بند کر رکھی تھی.....بہر حال رفعتؔ بھوپالی خوش قسمت تھے کہ مرزا نے ان کی خواہش کے احترام میں انہیں فارسی میں خط لکھا۔ یہ خط کلیات نثر غالبؔ مطبع نول کشور میں۔ص۶۔۲۴۵ پر، انشائے نور چشم (یار محمد خان شوکتؔ) مطبع نظامی کانپور میں ص۵۲۔۵۱ پر اور انشائے ''نور دیدہ'' قلمی از مولانا عباس رفعتؔ میں ص۵۴۔۵۳ پر موجود ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ کلیات نثر غالبؔ اور آخر الذکر دو کتابوں میں عبارت میں ۱۹ جگہ اختلاف ہے.....یہ خط غالبؔ کی حیات میں شائع ہوا۔ (سو) قرین قیاس یہی ہے کہ غالبؔ نے نظر ثانی کی ہو گی اور اس میں تبدیلی کر لی ہوگی۔''

اور اب آخر میں پروفیسر نذیر احمد کی کتاب ''غالبؔ پر چند مقالے'' میں مضمون بعنوان ''غالبؔ کا غیر مطبوعہ فارسی خط'' سے متعلقہ اقتباسات۔

''غالبؔ کے تین خط غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک فارسی اور دو اردو میں ہیں۔ فارسی خط مولانا محمد

عباس کے نام ہے۔اردو خط میں مکتوب الیہ یا مکتوب الیہم کے نام درج نہیں،لیکن یہ دونوں خط مولانا عباس رفعتؔ کے نام سے ڈاکٹر خلیق انجم نے غالبؔ کے خطوط جلد۲ میں ص۳۲۷۔۳۱۷ میں چھاپ دیے ہیں اور دونوں کے عکس بھی چھاپے ہیں.....ممکن ہے کہ یہ خطوط آفاق احمد صاحب کے توسط سے غالب انسٹی ٹیوٹ میوزیم کو ملے ہوں۔دونوں اردو میں ایک فارسی تینوں مکتوب غالبؔ کے اپنے خط میں ہیں۔معلوم نہیں کس بنیاد پر اردو کے دونوں خطوط کو مولانا عباس کے نام سمجھا گیا ہے۔بظاہر کوئی داخلی شہادت بھی نہیں۔بہر حال فارسی خط بلاشبہ مولانا عباس کے نام ہے۔

''جیسا کہ عرض ہو چکا ہے اس خط کے مکتوب مولانا محمد عباس تھے۔ان کی پیدائش ۱۲۴۱ھ میں بنارس میں ہوئی۔عربی اور فارسی میں بڑی دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔مگر قسمت میں گردش تھی تلاش معاش میں مختلف شہروں میں پھرے۔دلّی میں کافی دن رہے۔بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہوئی۔نواب صدیق حسن خاں اور نواب شاہ جہاں بیگم ان کے قدردان اور مربی تھے۔ان کی مدح میں مولانا نے قصائد لکھے۔۱۳۱۵ھ میں بھوپال ہی میں مولانا کا انتقال ہوا۔ان کا تخلص رفعتؔ تھا۔

''مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال میں تین فارسی رسالوں پر مشتمل ایک مجموعہ شمارہ ۶۱۷۔۶۱۵ ہے۔یہ تین رسالے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ خوش تاب تألیف موبد سروش شاگرد فرزانہ بہرام خلیفۂ کیخسرو واسفندیار بن آذر کیوان۔مبد سروش جاماسپ حکیم کی اولاد میں تھا۔ ۱۰۳۶ھ میں کشمیر میں ریاضت شاقہ میں مصروف تھا۔

۲۔ زردشت افشار تألیفِ داؤد پویہ ابن موبد ہوش آئیں،مؤلف دبستان المذاہب کے بقول زردشت افشار کا مؤلف موبد سروش بن کیوان بن کامگار تھا۔

۳۔ رسالہ اوّل کا ترقیمہ یہ ہے۔''درسال ۱۲۹۳ھ مولانا عباس رفعتؔ برائی دیدارِ جشنِ قیصری شاہ جہان آباد آمدہ وبنا بخواہش او شخص بنام ابوالقاسم درخانۂ منشی محمد علی در کشمیری دروازہ آنرا رونویس کرد۔

رسالہ دوم کے خاتمے کی عبارت یہ ہے''محمد عباس رفعتؔ درسال ۱۲۹۳ھ براہ ہوشنگ آباد،جبل پورالہ آباد،کانپور،بہ دلّی آمدہ

تیسرا رسالہ ابوالفضل علم الدین محمد عباس رفعتؔ کے خط میں ہے اور تاریخ کتابت ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ شاہ جہان آباد ہے۔

''یہ تینوں رسالے آذر کیوانی کے سلسلے کے ہیں۔اس فرقے کے نزدیک دساتیر آسمانی کتاب ہے۔اس کی صداقت شبہ سے پاک ہے۔اس فرقے کا بانی آذر کیوان ہے جو اولاً زرتشتی مذہب کا ماننے والا تھا۔اس نے آذر کیوانی فرقے کی بنیاد ڈالی جس میں زرتشتی عیسائی اور اسلامی عقائد کی آمیزش ہے۔ایران میں اس آزاد خیالی کے خلاف جب آواز اُٹھی تو اس کے پیرو ہندوستان آ گئے۔ان کا مستقر پٹنہ تھا۔یہاں ان لوگوں نے کھل کر اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔آذر کیوان کی طرف ایک منظوم فارسی کتاب کیخسر ومنسوب ہے۔(فرہنگ معینی۔جلد۴۔ص۱۵۔۱۴)۔

''آذر کیوانی سلسلے کا کافی لٹریچر ہے۔مولانا عباس اس فرقے سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اور اس سلسلے کی کتابوں سے دلچسپی کا راز اسی خیال پر مبنی ہے۔غالبؔ بھی دساتیر کے مندرجات کو صحیح اور اس کی زبان کو فارسی اصیل جانتے تھے۔چنانچہ ان کی اردو اور فارسی تحریریں اس بات کا بین ثبوت ہیں۔اور تو اور غالبؔ جو برہان غالبؔ کے مؤلف کے سب سے بڑے مخالف تھے لیکن چونکہ اس مؤلف نے برہان قاطع میں سارے دساتیری الفاظ بھر لئے ہیں،غالبؔ نے کتاب کے اس عنصر کو بہت سراہا ہے۔بقیہ کو ہیچ پوچ قرار دیا ہے۔ایسا خیال ہوتا ہے کہ غالبؔ کی

دساتیری اور آذر کیوانی تحریروں سے دلچسپی کے نتیجے میں یہ بزرگ بھی دساتیری فریب میں آئے ہونگے۔ یہ صرف انہیں پر موقوف نہیں سیکڑوں پڑھے لکھے لوگ اس کے جعل میں پھنسے اور دساتیری طرز میں کتابیں لکھیں لیکن بعد کے محققین نے اس جعل کا پردہ چاک کر دیا۔ بہر حال مولانا عباس کی دساتیر اور آذر کیوانی لٹریچر سے دلچسپی مزید تحقیق چاہتی ہے۔ غالبؔ کے خط میں ایک دساتیری لفظ 'پیرہ' ہے۔ دوسرا لفظ 'وخشور' ہے جو پیغمبر کے لیے فارسی اور دساتیر دونوں میں آتا ہے۔ غالبؔ نے اس لفظ کا استعمال اپنی اور تحریروں میں بھی کیا ہے۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے لکھنے تک غالبؔ کی بالمشافہ ملاقات مولانا عباس سے نہیں ہوئی تھی۔ اور جیسا کہ قبلاً لکھ چکا ہوں محمد عباس ۱۲۹۳ھ میں دہلی گئے تو کیا سمجھا جائے کہ اس سے قبل دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی!

''یہ خط ۱۲۷۸ کا ہے۔ تلامذۂ غالبؔ ص ۱۲۷ پر محمد عباس کی پیدائش کی تاریخ ۱۲۴۱ھ درج ہے۔ اس طرح ۱۲۷۸ ہجری (تک) محمد عباس کی عمر ۳۷ سال قرار پاتی ہے۔ ۳۷ سالہ جوان لڑکے کے لیے غالبؔ نے جس طرح تعریفی الفاظ لکھے ہیں اس پر حیرت ہوتی ہے.....۱۲۷۸ھ سے بہت پہلے سے غالبؔ نے فارسی میں لکھنا بند کر دیا تھا اور اس ۳۷ سالہ جوان کے فرمان کے تحت انہوں نے یہ خط فارسی میں لکھا جس پر دساتیری رنگ غالبؔ ہے۔ دساتیر کو غالبؔ اصل وقدیم فارسی کا نمونہ سمجھتے تھے۔ دستنبو کو انہوں نے اسی زبان میں لکھا ہے۔ چنانچہ مرزا تفتہؔ کے ایک خط میں ہے ''میں نے آغاز مئی ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی فارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے.....''۔

۳۔ سوانح:

مندرجہ بالا مضامین کے اقتباسات سے اگرچہ غالبؔ کے خط کے حصول، اس کے استناد اور اس کی زبان جیسے امور پر کافی آگاہی حاصل ہوئی لیکن مکتوب الیہ محمد عباس رفعتؔ کے سوانحی احوال پر چنداں روشنی نہ پڑ سکی۔ چنانچہ عنوان کی سیرابی اور مضمون کی تکمیل کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کے سوانحی احوال پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔ اور اس لیے بظاہر مالک رام صاحب کی، تلامذہ غالبؔ کی استمداد ناگزیر ہے کہ اس ضمن میں وہی ایک مرد میدان ہیں جنہوں نے سالوں کی جاں کاہی سے تلامذہ غالبؔ کے سوانحی احوال جمع کر کے ایک اہم ادبی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ چنانچہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے دوسرے ایڈیشن بسال ۱۹۸۴ کے صفحہ ۲۰۹ پر وہ مولانا ابوالفضل محمد عباس شروانی المخلص بہ رفعتؔ وسرورؔ کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

''ان کا خاندان ولایتی تھا۔ مذہباً شیعی تھے۔ ان کے جدّ امجد جابر ابن عبداللہ انصاری تھے۔ آبائے کرام مدینہ منورہ سے بغداد چلے آئے اور یہاں عزت واحترام سے رہتے رہے۔ پھر آب ودانہ کی کشش سے ہمدان (ایران) میں جا بسے۔ ان کے جدّ اعلیٰ مرزا محمد ابراہیم ہمدانی، نادر شاہ درّانی کے وزیر بھی رہے۔ لیکن شاہ مذکور کے ظلم وستم سے دل برداشتہ ہو کر نوکری سے استعفیٰ دے کر نجف اشرف میں روضۂ مبارکہ کے مجاور بن گئے۔ لیکن ان کے فرزند رشید مستوفی الملک مرزا محمد علی خان کو خود نادر شاہ نے ہلاک کر کے گھر بار تاراج کر ڈالا۔ ان کی اولاد خوف سے اِدھر اُدھر منتشر ہوگئی۔ ان کے بھائی مرزا محمد حسن خان ترک وطن کر کے ہندوستان پہنچے اور بنارس میں مقیم ہوگئے۔ مستوفی الملک مرزا محمد علی خان کے بیٹے مرزا محمد تقی روپوش ہو کر شروان میں رہنے لگے اور چند دن بعد نجف اشرف پہنچ کر سید مہدی طباطبائی مجتہد المعصر کے سامنے زانوائے ادب تہ کیا اور فقہ وحدیث وتفسیر میں دستگاہ حاصل کی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے چچا مرزا محمد حسن خان بنارس میں مقیم ہیں تو وہ یہاں آگئے۔ لیکن چچا کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے گئے جہاں اُن دنوں آصف الدولہ کی حکومت تھی۔ انہوں نے خوب آؤ بھگت کی اور ان کی

آرام وآسائش سے بسر ہونے لگی۔ کچھ مدت بعد انہوں نے یمن کی راہ لی جہاں ایک تاجر محمد حیدر بغدادی ءکی دختر نیک اختر سے نکاح کیا۔ جن کے بطن سے شیخ احمد شروانی پیدا ہوئے جو محمد عباس رفعتؔ کے والد بزرگوار تھے۔

''شیخ احمد شروانی کمالات علمی وعملی کی تحصیل کے بعد عنفوان شباب میں یمن سے ہندوستان آئے اور کلکتہ میں وارد ہوئے۔ یہاں حکام فرنگ کی قدر شناسی کے سبب انہیں مدرسۂ عالیہ میں عربی زبان وعلوم پڑھانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ اس ملازمت کے دوران ہی انہوں نے بڑی اہم کتابیں تالیف کیں جو اسی زمانے میں شائع بھی ہوگئیں۔ ان میں اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں۔ حدیقۃ الافراح (۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۳ء) منہاج البیان الشافی فی العلم العروض و القوافی (۱۸۳۴ھ اور ۱۸۴۶ء) العجب العجائب (۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء) نفحۃ الیمن (۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء)۔ اسی زمانے میں انہوں نے الف لیلیٰ بھی مرتب کی جس کی اصل غالباً کوئی مصری نسخہ تھی۔ انہوں نے صرف پہلی دوسو راتوں کو درست کیا اور ان کو دو جلدوں میں ۱۸۱۴ء۔۱۸۱۸ء میں شائع بھی کر دیا۔ سر رچرڈ برٹن نے جب الف لیلیٰ کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو اس نسخے سے بہت مدد لی۔

''کچھ عرصے بعد نوکری کو خیر باد کہہ کر شیخ احمد لکھنؤ چلے گئے۔ یہ غازی الدین حیدر شاہ کا زمانہ تھا..... یہاں لکھنؤ میں رکن الدولہ سید محمد اسمعیل خان رضوی مرشد آبادی نے اپنی صاحبزادی کے حبالۂ عقد میں دیدی۔ شیخ محمد عباس رفعتؔ اسی ازدواج کا نتیجہ ہیں۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد..... شیخ احمد شروانی کا دل لکھنؤ سے اچاٹ ہوگیا اور وہ کانپور، بنارس، حیدرآباد، بھوپال، بمبئی وغیرہ کی سیاحت کرتے پونا پہنچے اور وہیں ۱۸۴۰ء (۱۹ ربیع الاوّل ۱۲۵۶ھ) کو رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ تکیہ رضا شاہ میں مدفون ہیں۔

''محمد عباس رفعتؔ ۲۲ شوال ۱۲۴۱ھ (۳۰ مئی ۱۸۲۶ء) کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ عربی اپنے والد ماجد اور فارسی شیخ علی حزیں کے شاگرد خیرات علی خان مشتاق خیر آبادی سے حاصل کی۔ چودہ برس کے تھے جب والد کا انتقال ہوگیا۔ چونکہ ان کے چچا نے انہیں جائیداد پدری سے محروم کر دیا تھا اس لیے یہ بھی ایک عرصے تک ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر کرتے رہے۔ طبیعت سپاہ گری کی طرف مائل تھی۔ اس سے متعلق فنون میں معقول مہارت بہم پہنچائی۔ قسمت آزمائی کے لیے دکن گئے لیکن کام نہ بنا اور دلّی آئے اور یہاں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہوئی۔ مرزائی، اور 'خانی' اور ''ابوالفضل دوران'' کے خطابات عطا ہوئے۔ ان ہی ایام میں غالبؔ سے ملاقات ہوئی۔ اور انہوں نے اپنے فارسی کلام بالخصوص قصائد پر ان سے اصلاح لی..... یہاں سے نکلے تو بھوپال پہنچے اور نواب جہانگیر محمد خاں بہادر شمشیر جنگ (نواب شاہ جہان بیگم والیہ بھوپال کے والد) کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ نواب قدسیہ بیگم کے متوسلین میں بھی رہے۔ پھر کچھ عرصہ تجارت بھی کی لیکن جب والا جاہ سید محمد صدیق حسن خان بہادر کا نکاح نواب شاہ جہان بیگم سے ہوا تو انہوں نے از راہ قدردانی انہیں اپنے پاس بلا لیا اور یہ ریاست کے ملازموں میں شامل ہوگئے۔ محکمۂ تنظیمات شاہ جہانی (یعنی قانون اور تاریخ نویسی) ان کے سپرد ہوا۔ سو روپے مہینہ مقرر ہوا۔ بقیہ ساری عمر یہیں گزاری۔

''نواب محمد صدیق خان غالی سنّی بلکہ ہندوستان میں وہابیت کے علمبردار، اس کے برعکس رفعتؔ شیعی جن کے نام کا سجع تھا ''شیعۂ آل محمد عباس''۔ لیکن دونوں میں ایسی خوش اسلوبی سے نبھی کی رفعتؔ کو مرتے دم تک بھوپال سے باہر قدم رکھنے کا خیال تک نہ آیا۔

''عربی اور فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ ادب، علم کلام اور تاریخ میں وحید عصر تھے۔ فارسی نظم ونثر پر بھی قادر تھے۔ چھوٹی بڑی چھونسٹھ کتابیں تصنیف کیں۔ نہ معلوم کس بات پر دل برداشتہ ہوکر اپنی بیاض بھوپال کے تالاب میں ڈال دی اور شعر گوئی سے توبہ کر لی۔ اگرچہ ایک دوشعر

اردو کے بھی ملتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے یہ محض بطور تفنن کہے گئے تھے۔ دراصل فارسی ہی میں کہتے تھے۔ جو کلام منتشر حالت میں ملتا ہے۔ اسی سے یہ انتخاب درج ہے۔ ان کے بہت سے قصیدے نواب محمد صدیق حسن خان بہادر اور نواب شاہ جہان بیگم والیہ بھوپال کی مدح میں موجود ہیں۔

''محمد عباس رفعتؔ ۱۳۱۵ھ (۹۸۔۱۸۹۷) بھوپال ہی میں فوت ہوئے۔ میرزا محمد تقی کمال الدین سنجر طہرانی نے تاریخ کہی۔ مصرع تاریخ ہے۔ ع آہ از مرگِ ابوالفضل کمال (۱۳۱۵ھ)۔ بھوپال میں احمد آباد روڈ پر کربلا میں سپرد خاک ہوئے۔ اولاد میں دو صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ ابوالقاسم محتشم اور ابوالحسن محترم۔ علم و فضل میں دونوں اپنے اسلاف کے جانشین تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

درد سرِ من بہ شدنی نیست مسیحا
بیہودہ بخود راہ مدہ دردِ سری را
مہر و مہ و انجم ہمہ ہا گرمِ گزاف اند
وقت است کہ آغاز کنی جلوہ گری را

.....

سوز من از گریہ ہر گز کم نہ گردد مثلِ شمع
آبِ اشکم برسرِ آتش مثالِ روغن است
یافت بازار محبت، رونقے از داغِ من
دو دمان عشقِ از نور چراغم روشن است

.....

راوقِ شیراز و ماء الورد می باید کشید
ایں مرکب دراوان برد می باید کشید
در فراقِ دلبر شیریں دہن رخ ناردن
آہ سرد از سینۂ پر درد می باید کشید
مقطع صائبؔ خوش است اے سرورؔ والا گہر
بر سر لوح طلائے زرد می باید کشید
ہر چہ می خواہی طلب کن صائبؔ از شاہِ نجف
منّتے گرمی کشی از مردمی باید کشید

.....

دور از بندِ کمندِ سبحہ و زنّار باش
مست ''یا قدوّس'' گویاں بر درخمّار باش

مشربِ رنداں خوش است و عیش ایناں بے گزند
نغمۂ یا ہو چوقمری خوان و در گلزار باش
بزم رندانست پاس عزت اینجا لازم است
جائے خفتن نیست این دارِ فنا بیدار باش
می نمایئم رہ ترا ای راہ جو از ماہِ صدق
سالک راہِ قویمِ حیدرِ کرّار باش

اب آخر میں یہ عرض ہے کہ یہ خط آہنگ پنجم مرتبہ وزیرالحسن عابدی وشائع کردہ مجلس یادگارِ غالبؔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سنہ ۱۹۶۹ء کی فہرست مکتوبِ الہیم میں نمبر ۱۶۴ دراصل کتاب میں ص ۵۸۷ پر موجود ہے اور اس متن سے جو ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مضمون میں لیا ہے اور جو اس مقالے میں ابتدا ہی میں دیا گیا ہے متن کے اختلافات بیسیوں ہی ہیں۔ جب کہ آفاق احمد صاحب نے صرف ۱۹ بتائے ہیں۔

کتابیات

۱۔ کلیات نثر غالب۔ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ انڈیا۔
۲۔ پنج آہنگ۔ مطبوعات مجلس یادگارِ غالب۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹۔
۳۔ غالبؔ پر چند مقالے۔ پروفیسر نذیر احمد
غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط۔
۴۔ غالب کے نام دو غیر مطبوعہ خطوط از ڈاکٹر سید حامد حسین۔
نقوش غالبؔ نمبر حصہ دوم شمارہ ۱۱۳۔ ۱۹۶۹۔
۵۔ غالبؔ کے نو دریافت خطوط۔ آفاق احمد نقوش غالبؔ نمبر

غالبؔ کا ایک نایاب ونو دریافت فارسی خط

بنام سید ابن حسین خان صاحب بہادر ولد مجدالدولہ نیاز حسن خان بہادر شیر جنگ

اردو ترجمہ: پرتوؔ روہیلہ

فارسی متن

در گردِ نالہ وادیٔ دل رزم گاہِ کیست
خونے کہ می دود بہ شرائیں سپاہ کیست

بادِ جنبش بالِ ہمائے کہ ناگاہ سایہ برسرم گسترد، پردۂ بے گانگی از روئے یگانگی برافگند وگرم خوئی دل بہ نگرستنِ عنوانِ نگاریں نامہ مرابہ شگفت زارافگند کہ آیا جنبیدن مہرِ دیرینہ ازکجاست واز اندازہ گزشتن جوشِ خوں درسینہ چراست۔ گفتم ایں پیودِ بنوید مانندِ راہ آوردرواں گردخواہد بود۔ بارے کشایشِ نورِ دِنامہ نمایشِ نشان ہائے خرامِ خامہ آ گہی افزود کہ ہر چند پرتو مہرِ ازل دردل افروزی است اما روشناسی پیکری نیز نہ امروزی است۔

آ شکارا بتو از خویش نشاں باز دہم
گر دلت در گروِ پرسشِ پنہانِ من است

نامہ نگار پایانِ فرماں روائی شاہِ زمن وانجام کار کیائی معتمدالدولہ بہ لکھنؤ روئے آوردہ وکمابیش پنج ماہ دراں شہر آب خوردکردہ، رمضان بیگ نام آزادۂ کہ از پدرم حقِ نان ونمک بہ گردن داشت، ودرآں روزگار ریزہ چین خوانِ نوال مرحوے مجدالدولہ سیّد نیاز حسن خاں بودتاآ مدنِ من شنود، بہ دیدنِ من آمدوخوبی از اندازہ بیروں بردوبہ ازرم گستری وشناسا گری میانہ من ونام آورستودۂ مہرپدید آورد۔ ہمانا غالبؔ بے نام ونشان اگرخودرافروشد از روئے ارزش نیم کاہِ ارزاں است، ازدیریں مہرورزاں است۔ بہ نام ایزددرفن نگارش گزین شیوہ گزیدہ ونامہ باآں آ ئین نوشتہ اند کہ اگر دیدہ وراں از پروین وپرن براں سوادسپندسوزند، جادارد۔ مراخودازبیم چشمِ زخمِ خویشتن لب از اُن یکاد، خوانی ریش است و چشمکِ نہانی بہ سوئے خویش، تاپاسخ چہ گزاردہ آیدودرنوردواندیشہ گزارش چہ روئے نماید۔

خواہش حکّ واصلاح برسرنوشت خودم نازاں کرد۔ حاشا کہ ازیں نثر رنگین تر ازگُل کہ اگر بہ مثل ازاں ہمہ برحرفے انگشت نہند سرِ انگشت چوں غنچہ نگاریں گردد، حرفے تواں ستود۔ داغم کہ ازاجزائے خطابِ خویش ہیچ نشان از نامہ نہ گزاشتند تا نامہ نگار اور آرایشِ عنواں بہ کار آمدے۔ سپس خاتمہ راز روئے مہر بہ مُہر آرایند کہ آرزوئے من است، والسلام مع الاکرام (۱)۔

اردوترجمہ

در گردِ نالہ وادیٔ دل رزم گاہِ کیست
خونے کہ می دو دبہ شرائیں سپاہِ کیست

ترجمہ: نالہ وفریاد کے غبار میں وادیٔ دل کس کی رزم گاہ بن گئی ہے۔ (اور) وہ خون جو شریانوں میں دوڑ رہا ہے کس کی سپاہ ہے۔

ہما کے پروں کی حرکت کی ہوانے اچانک میرے سر پر سایہ فگن ہوکر یگانگت کے چہرے سے بیگانگی کا پردہ ہٹا دیا اور جذبۂ دل نے اُس منقش خط کے دیدار ہی سے حیرت میں ڈال دیا کہ بھلا یہ دیرینہ محبت کی (سلسلہ) جنبانی کہاں سے ہورہی ہے، اورسینہ میں جوش خون حد سے زیادہ کیونکر ہے۔ میں نے (دل میں) کہا (آپ کا یہ قلمی) رابطہ (میرے لیے) عالم بالا کی سوغات ہوگا۔

بارے خطِ پرنور کی کشائش اور قلم کے آثار خرام کے دیدار نے آ گہی میں اضافہ کیا (اورظاہر ہوگیا) کہ بلاشبہ ہمارے دلوں میں محبت ازلی کا عکس روشن ہے۔ تاہم عالمِ جسمانی میں بھی ہماری واقفیت نئی نہیں ہے۔

۱۔ برہانِ اودھ: مصنفہ سید ابن حسن خاں ص ۲۷۴۔۲۷۵

آ شکارا بتو از خویش نشاں باز دہم
گردلت در گروِ پرسشِ پنہاں من است

؎ میں تجھے صاف صاف اپنا پتہ بتائے دیتا ہوں۔ اگر تیرا دل میری پرسشِ پنہاں میں گرفتار ہے۔

مکتوب نگار، شاہِ زمن کی فرمانروائی کے بعد اور معتمد الدولہ کے عہدِ حکومت کے اختتام پر لکھنؤ گیا تھا اور وہاں کم وبیش پانچ ماہ بسر کئے تھے۔ رمضان بیگ ایک آزاد منش نے کہ جس پر میرے والد کا حق نمک واجب تھا اور جو اُن دنوں مجدّ الدولہ سید حسن خان کے خوانِ کرم کا ریزہ چین تھا، جب میرے آنے کا سنا تو مجھ سے ملنے آیا اور آشتی وتواضع کی انتہا کر دی۔ اور (اس طرح) صلح جوئی اور آشنا نوازی کے سبب اُس نام آورِ خوش خلق اور میرے درمیان محبت ہوگئی۔ یقیناً غالبؔ بے نام ونشاں اگر اپنے آپ کو فروخت بھی کرے تو (اگر چہ) اب قیمتاً وہ گھاس کے تنکے کے برابر بھی نہیں (لیکن) دیرینہ محبت کرنے والوں میں ہے۔ خدا کی قسم جناب عالی نے فن تحریر میں (وہ) منتخب انداز اپنایا ہے اور اس انداز سے لکھا ہے کہ اگر اہل نظر پروین و پرن کو اس لیاقت پر (بطور ردِّ نظر) سپند کی جگہ جلائیں تو بجا ہوگا۔ مجھے خود اپنی نظر لگ جانے کا اس قدر خوف ہے کہ ''این یکاد'' پڑھ پڑھ کر میرے ہونٹ زخمی ہوگئے ہیں اور خود اپنے آپ سے حسد کرنے لگا ہوں تو بھلا اس کا جواب کیا لکھا جا سکتا ہے اور ان خیالات کے ہوتے ہوئے عرض بھی کیا کیا جائے۔ جناب کی حکّ واصلاح کی خواہش نے مجھے اپنے نوشتۂ تقدیر پر نازاں کر دیا۔ مجال ہے جو کوئی اس پھول سے زیادہ رنگین نثر کے ایک حرف کی بھی (بقدر بایست) تعریف کر سکے۔ ایسی رنگین (نثر) کہ اگر اس کے ایک حرف پر بھی کوئی انگلی رکھ دے تو سرانگشت (رنگین و) منقش ہو جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اپنے اجزائے خطابی سے خط میں کوئی ایسی ا۔ قرآن کی آیت جو ردّ نظر کے لیے عام طور پر پڑھی جاتی ہے۔

نشانی نہیں چھوڑی جو پتہ کی زینت کے لیے کام آ سکتی۔ پس (میرے اس) خاتمۂ (خط) پر محبت کے ساتھ اپنی مہر لگا دیں کہ میری یہی آرزو ہے اور میری طرف سے والسلام مع الاکرام (قبول کریں)۔

۲۔ دریافت وتوضیحات

مختار الدین احمد آرزوؔ

رسالہ اردو ادب۔ علی گڑھ جولائی تا دسمبر ۱۹۵۲

''سید ابن حسن خاں، مجد الدولہ سید نیاز حسن خاں بہادر وشیر جنگ کے لڑکے تھے۔ جو غالباً سلطنت اودھ میں کسی ممتاز عہدے پر متمکن تھے اور مجد الدولہ شیر جنگ کے خطابات بھی انہیں وہیں سے ملے ہونگے۔ کوئی دو سال ہوئے راقم نے ان کے دو فارسی مکتوب مرزا غالبؔ کے نام اور غالبؔ کا ایک مکتوب ان کے نام دریافت کیا ہے جو ان کی ایک غیر مطبوعہ فارسی کتاب 'برہان اودھ' کے آخر میں درج ہے۔ ابن حسن خان کے دونوں مکتوب طویل ہیں۔ پہلا نو صفحوں کا ہے جس میں انہوں نے مرزا کو لکھا ہے کہ آپ کے کچھ اشعار دیکھنے میں آئے جن سے جودت معانی، نجابت الفاظ، صلابت فکر، غرابت ترکیب، قدرت سخن اور مہارت فن کا پتا چلا، آپ کا سخن ہر سخن پر غالبؔ اور آپ کے اشعار ہر طالب کا مطلوب۔ اس کے بعد مرزا کی تعریف وتحسین اس انداز میں شروع ہوگئی ہے کہ قصیدۂ نثر کا لطف آنے لگتا ہے۔ پھر طویل تمہید کے بعد حرف مطلب زبان پر لائے ہیں کہ میری تحریروں کو اپنی اصلاح سے مزین کیجئے اور مجھے اپنے سلسلۂ تلامذہ میں داخل کیجئے۔ مرزا غالبؔ نے اس کے جواب میں فارسی ہی میں ایک خط لکھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تصنیف ''مہر نیمروز'' کا ایک نسخہ انہیں بھجوا دیا۔ خط میں انہوں نے اپنے ان تعلقات کا ذکر کیا جو ان کو مکتوب الیہ کے والد سے تھے اور قیام لکھنؤ کے دوران جو کرم اور مہربانی انہوں نے کی تھی اسے بیان کیا۔ اصل مقصد کے جواب میں لکھا کہ آپ کے کلام کی اصلاح میرے لیے باعث عزّ وناز ہے اور آپ کی نثر تو پھول سے زیادہ رنگین ہے۔

''سید ابن حسن خان نے مرزا کے مکتوب اور تحفۂ مہر نیمروز کی رسید اور شکریے میں انہیں ایک خط لکھا۔ ابن حسن خان کے دونوں خطوط اور مرزا غالبؔ کا نایاب خط یہی نہیں کہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے وجود کی بھی لوگوں کو اطلاع نہیں ہے۔ یہ تینوں خط پہلی مرتبہ ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

''مکتوب الیہ کے متعلق بہت سی باتیں تحقیق طلب ہیں اب تک جو معلوم ہوئی ہیں ان میں بعض مختصر طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان کا تعلق بلگرام سے ہے لیکن قیام لکھنؤ کی مناسبت سے لکھنوی کہلاتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے عربی فارسی کی بہت اچھی واقفیت کا پتا چلتا ہے۔ تاریخ، شاعری اور مذہبیات ان کے خاص موضوعات معلوم ہوتے ہیں۔ ''برہان اودھ'' کے علاوہ جو فارسی میں اودھ کی تاریخ ہے ان کی کوئی اور تصنیف دیکھنے میں نہیں آئی..... شعر بھی کہتے تھے۔ برہان اودھ میں مقدمہ اور دوسرے مقامات پر اپنے فارسی اشعار نقل کئے ہیں جو اوسط درجے کے ہیں۔ مرزا غالبؔ کے خطوط میں مجھے ان کا ذکر صرف ایک جگہ مل سکا جس سے قیام بلگرام کے علاوہ ان کی وارستہ مزاجی کا بھی پتا چلتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مرزا ان کی شاعری اور ان کے علم کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ اور یہ کہ جب مرزا خود ''یک مشت استخواں بوسیدہ و ناتواں'' ہو گئے تھے ابن حسن خان جوان تھے۔ مرزا غالبؔ لطیف احمد بلگرامی سے خدمتِ اصلاح شعر کی معذرت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سید ابن حسن خاں وہاں موجود ہیں (میں) یہاں محض وجود بے جود، وہ تو میرے نزدیک علاّمہ ہیں اور جوان ہیں۔ میں ان کے نزدیک ایک مشتِ استخواں ہوں وہ بھی بوسیدہ اور ناتواں۔ اگر خان صاحب وارستۂ مزاج ہیں اور جوان ہیں تو سید غلام حسین قدرؔ سہی۔ وہ تو میرے قدردان بھی ہیں اور شاگرد بھی ہیں۔ اگر کچھ بھی اپنے دل و دماغ میں قوت پاتا تو اپنی طبیعت کو آپ سے اصلاً دریغ نہ کرتا.....''

''ابن حسن خاں کے لڑکے خورشید حسن بھی شاعر تھے اور ایک فارسی تحریر برہان (اودھ) سے متعلق اس کے آخر میں درج ہے۔ ارشد بلگرامی کے قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حسن خاں کا سال وفات ۱۲۸۵ھ ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی خوش نویسی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ذخیرۂ احسن مارہروی میں نزہتہ اثنا عشر بر ذیل تحفۂ اثنا عشریہ (مصنفہ حکیم مرزا محمد بن عنایت احمد دہلوی) کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس کے کچھ اجزا کی کتابت ابن حسن خان نے بھی کی ہے اور ان کے قلم کا ایک حاشیہ بھی ان کے دستخط کے ساتھ درج ہے (ص ۶۶) اس سے تو ان کی خوش نویسی کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوئی.....

''غالبؔ کے اس خط کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس سے ان کی زمانۂ قیام لکھنؤ میں مدد ملتی ہے اور ایک گتھی جسے غالبیات کے ماہرین اب تک حل نہیں کر سکے تھے وہ سلجھتی ہوئی نظر آتی ہے اور اب تک کے محققین کا یہ خیال ہے کہ غالبؔ کا قیام لکھنؤ میں ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ رہا یا یہ کہ وہ لکھنؤ سے ایک بار جا کر کانپور سے پھر واپس آئے، باطل ہو جاتا ہے۔

''غالبؔ کے ایک فارسی خط بنام رائے چھجمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۲۶ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ (مئی ۱۸۲۷ء) بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے تھے۔ یہ نہیں کھلتا کہ دلّی سے کب روانہ ہوئے اور لکھنؤ کب پہنچے۔ اس موضوع پر سب سے زیادہ مولانا غلام رسول مہرؔ نے لکھا ہے۔ ان کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ عید شوال ۱۲۴۲ھ میں دہلی سے نکلے کچھ دن لکھنؤ میں رہے، پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ کان پور سے دوستوں کے اصرار پر لکھنؤ واپس آئے اور پھر ٹھہر کر کلکتہ کو روانہ ہوئے۔

''یہ ساری دقتیں دو امور کی وجہ سے ہیں۔ لکھنؤ آنے کی تاریخ اور زمانۂ قیام لکھنؤ کی مدت معلوم نہیں اور مرزا کی نثر تعطیل پر ۲ محرم الحرام کی تاریخ درج ہے جو انہوں نے دورانِ قیام لکھنؤ میں شاہ اودھ کو پیش کرنے کے لیے مرتب کی تھی۔

''راقم کی رائے میں نثر کی تاریخ کو زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیے۔ وہ نثر صنعت تعطیل میں لکھی گئی ہے جس میں غیر منقوطہ حروف کا التزام ہوتا ہے اور انگریزی اور عربی مہینوں میں محرم کے علاوہ کسی مہینے کا نام ایسا نہیں جس میں نقطے نہ ہوں اور تاریخوں میں دوم، پہلی تاریخ ہے جس میں نقطے نہیں۔ اس لیے غالبؔ نے دوم محرم الحرام لکھ دیا۔ ظاہر ہے وہ فرضی تاریخ نثر لکھنے کی تھی نثر پیش کرنے کی نہیں۔ یوں بھی مرزا کی دستخطی تحریر تو ہماری نظر سے اوجھل ہے۔ ممکن ہے کہ جو تحریر مرزا نے پیش کرنی چاہی ہو اس میں سرے سے کوئی تاریخ درج نہ ہو اور اس تاریخ کا اندراج انہوں ن ے اس نثر کی اشاعت پر کیا ہو۔

''اسی خط سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مرزا کا قیام لکھنو میں پانچ ماہ رہا۔ لکھنؤ چھوڑنے کی تاریخ معلوم ہے۔ ان کے لکھنؤ آنے کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ رجب ۱۲۴۲ھ میں لکھنو آئے ہونگے.....

''مکتوب غالبؔ پر تاریخ درج نہیں لیکن یہ خط مہر نیمروز کے ساتھ مکتوب الیہ کو بھیجا گیا تھا۔ قیاس غالب ہے کہ نسخۂ مطبوعہ بھیجا ہوگا۔ یہ کتاب ۲ ربیع الاوّل ۱۲۷۱ (۲۴ دسمبر ۱۸۵۴ء) سے پہلے چھپ گئی تھی۔ اس لیے اس خط کا زمانۂ تحریر اس کے کچھ بعد ہی سمجھنا چاہیے۔''